...اللہ غلام کی سی شکل نہ دے!

عظیم اختر

B-1، سیکنڈ فلور، پلاٹ نمبر 49/2B، مغل اپارٹمنٹ، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی، موبائل: 9810439067

عزیز و اقارب اور گھر والوں کے لاڈ پیار میں بچوں کے بگڑے ہوئے ناموں کے اثرات زندگی اور شخصیت پر مرتب ہوتے ہیں، اس کے بارے میں تو آپ حضرات کی طرح ہم بھی کچھ نہیں جانتے اس لیے لب کشائی کر ہی نہیں سکتے، لیکن ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ماں باپ اور محلے والوں کے لاڈ پیار کی بدولت بگڑے ہوئے نام کے اثرات ہمارے دوست بھائی ممدو کی زندگی پر ضرور مرتب ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سنجیدگی اور متانت عطا کی، لیکن یہ چہرے مہرے سے سنجیدہ نظر آنے کے بجائے مردم بیزار نظر آتے ہیں اور مردم بیزاری بھی ایسی کہ عام آدمی بھی بات کرتے ہوئے گھبرائے یا کبھی بھولے بھٹکے ہنسیں تو پتہ نہ چلے، مغموم ہوں تو کسی کو احساس نہ ہو اور لطیفہ سنائیں تو پند و نصیحت کا گمان ہو۔

پیدا ہوئے تو گھر کے بزرگوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اور سوچ سمجھ کر محمد علی جیسا اچھا خاصا نام رکھا۔ ہمارے معاشرے میں بیٹوں سے غیر معمولی لاڈ پیار کیا جاتا ہے چنانچہ ماں بہنوں نے لاڈ پیار میں ممدو میاں کہنا شروع کیا اور یہ سب کے لیے ممدو ہو گئے۔ بڑے ہوئے اور اسکول میں داخلہ دلایا گیا تو ہم جماعت لڑکوں نے ممدو کے ساتھ ایلو کا سابقہ اور جوڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے اسکول میں ممدو اور ایلو کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ دوستوں اور عام سماجی حلقوں میں اسی نام سے جانے اور پہچانے جانے لگے۔ ممدو اور آلو کے کمبینیشن نے یہ اثر دکھایا کہ پڑھے لکھے اور گریجویٹ ہونے کے باوجود یہ کہیں سے کہیں تک بھی پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کو دیکھ کر بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھانے والے مولوی کا گمان ہوتا ہے۔ کسی سرکاری دفتر میں بڑے بابو کے عہدے پر فائز ہیں، لیکن وہاں بھی بڑے بابو کے علاوہ سب کچھ نظر آتے ہیں۔ یہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور بڑے بابو سے ملنے والے وزیٹرز ان سے پوچھتے ہیں کہ ''اے بھائی بڑے بابو کب ملیں گے؟''

وجاہت اور جاذب نظر چہرہ مہرہ تو قدرت کی دین ہے اگر اس پر انسان کا بس چلتا تو دنیا میں ہر چلتا پھرتا شخص یوسفِ ثانی ہی نظر آتا، لیکن جس طرح مشاعروں کی دنیا میں گائیکی نما ترنم اور لٹکوں، جھٹکوں میں شعر کے تمام عیوب چھپ جاتے ہیں اور ساقط البحر اور بے وزن شعر بھی سامعین کی سماعتوں کو متاثر کرتے ہیں اور داد و ستائش سے خاصے نوازے جاتے ہیں، اسی طرح عام سماجی زندگی میں خوش لباسی اور جسم پر اچھی وضع قطع کے کپڑے شکل و صورت کی خداداد کمیوں کو نمایاں نہیں ہونے دیتے۔ پتہ نہیں اچھی وضع قطع کے کپڑے پہن کر شخصیت کو جاذب نظر بنانے کا یہ نسخہ موصوف نے مغربی دنیا کے کسی مفکر و دانشور کی کتاب میں پڑھا یا ریڈی میڈ کپڑوں کی کسی مشہور کمپنی کے اشتہار میں دیکھا، بہر حال جدید وضع قطع کے کپڑے پہن کر دوسروں سے ممتاز نظر آنے اور اپنی شخصیت کو جاذب نظر بنانے کے لیے موصوف نے کناٹ پلیس، قرول باغ، چاندنی چوک اور لاجپت نگر کے بازاروں میں ریڈی میڈ کپڑوں کی مشہور دکانوں کا رخ کیا، لیکن کلر اور میچنگ کمبینیشن کے معاملے میں ہمارے بھائی محمد علی ممدو اور ایلو ہی رہے۔ دسیوں دکانوں کے چکر کاٹ کر اور گھنٹوں ضائع کر کے چار پانچ رنگین قمیصیں، مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی ٹائیاں، فلیٹ ہیٹ اور جدید ڈیزائن کی جینز اور ٹراؤزر خریدے اور ڈبوں سے لدے پھندے گھر لوٹے۔ ایک دو دن کے بعد ان نئے کپڑوں کا شری گنیش کرتے ہوئے موصوف جب ہرے رنگ کی قمیص پر لال ٹائی باندھ کر اور سر پر فلیٹ ہیٹ لگا کر دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو گلی کے کسی منچلے نے پیچھے سے آواز لگائی ''میاں طوطے، صبح ہی صبح کہاں چلے۔'' گلی کے نکڑ تک یہ آواز وقفے وقفے سے بھائی ممدو کا پیچھا کرتی رہی۔ بھائی ممدو اس آواز پر چونکے، لیکن سنا ان سنا کر کے دفتر کی راہ لی۔ شام کو جب دفتر سے گھر لوٹے تو گلی کے ایک دکاندار کی آواز سنائی دی جو دہلی کے خالص کرخنداری لہجے میں کسی دوسرے دکاندار سے مخاطب تھا ''میاں بھائی شدّو، گھر والی نے کئی دن سے طوطا پالنے کی رٹ لگا رکھی ہے.....'' لیکن اس سے پہلے کہ شدّو دکاندار کچھ جواب دیتا بھائی ممدو نے تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ پرانی دہلی میں پرورش پانے اور خالص کرخنداری ماحول میں ہوش سنبھالنے والے بھائی ممدو کی چھٹی حس فوراً جاگ اٹھی اور اس خوف سے کہ کل کلاں محلے والوں کی یہ پھبتی بھی بیٹھے بٹھائے ان کے نام کا حصہ نہ بن جائے گھر پہنچ کر پہلی فرصت میں چاؤ سے خریدی ہوئی ہری قمیص، لال ٹائی اور فلیٹ ہیٹ کو پرانے کپڑوں کی پوٹلی میں دبا دیا تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

چند دنوں کے بعد موصوف کو دولہا کے جوڑے میں ملنے والی اپنی شادی کی شیروانی یاد آئی، چنانچہ پہلی فرصت میں شیروانی ڈھونڈی گئی، احتیاط سے سلوٹیں دور کیں اور ایک دن اپنے دفتری ساتھیوں کو ماضی قریب و بعید کے شرفا کے اس لباس سے متاثر کرنے کے لیے شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور سر پر باوا آدم کے

زمانے کی ترکی ٹوپی پہن کر گھر سے نکلے اور ابھی چند قدم ہی طے کیے تھے کہ ایک دکاندار نے بھائی ممدو کو بڑی محبت سے سلام کرتے ہوئے کہا کہ: ''میاں بھائی ممدو، نظر بھی اتروالی ہے؟ آج تو ماشاءاللہ بڑے شریف نظر آرہے ہو۔'' بھائی ممدو خاموش رہے، سلام کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے، لیکن دل ہی دل میں بڑبڑا رہے تھے کہ کیا اب تک میں شہدا ہی نظر آتا تھا۔ تھوڑی دور چلے تھے ایک دوسرے دکاندار نے آواز لگائی ''میاں بھائی ممدو زندہ باد۔ آج تو خدا کی قسم ترکی کے مصطفیٰ کمال پاشا بنے ہوئے ہو۔ میں نے اسکول کی کتاب میں اس کا فوٹو دیکھا تھا.....'' بھائی ممدو گردن ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے، لیکن شام تک دفتر میں بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ اس دکاندار نے ان پر پھبتی کسی تھی یا ان کی خوش لباسی پر کمپلیمنٹ پاس کیا تھا۔ بہرحال شام کو جب دفتر سے گھر لوٹے تو محلے کے بہت سے دکانداروں نے دیکھا کہ پھندنے دار ترکی ٹوپی ان کے تھیلے میں چھپی ہوئی تھی اور شیروانی بغل میں دبی ہوئی شکوہ بہ لب تھی۔ اس کے بعد بھائی ممدو نے خوش پوشاکی کے خیال کو دل سے نکال دیا اور دہلی کی گلیوں کے ایک عام سے محمد علی عرف بھائی ممدو ہو گئے۔

بھائی ممدو سے ہماری پرانی یاداللہ ہے۔ کبھی کبھی گھومتے ہوئے ہماری طرف آجاتے ہیں۔ ایک دن آئے تو چہرے پر قدرے ورم تھا اور ایک گال پر خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم نے خیر و عافیت پوچھی تو بڑی مری ہوئی آواز میں بولے: ''میاں عظیم صاحب پرسوں مجھ پر قیامت گزر گئی۔ ماں باپ کی دعاؤں اور گھر والی کی نیکیوں نے بچالیا ورنہ ان لوگوں نے کسر تو کوئی نہیں چھوڑی تھی۔'' یہ سن کر ہم چونکے اور بولے: ''میاں بھائی ممدو ہوا کیا؟'' وہ بولے: ''بھائی بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، تم تو اپنے ہو کسی اور کو مت بتانا ورنہ محلے والے کھلی اڑائیں گے۔ ہم نے ان کو تسلی دی اور تمام باتوں کو اپنے تک ہی رکھنے کا یقین دلایا تو وہ بولے پرسوں 'پے ڈے' تھا۔ میں تنخواہ لے کر عام طور پر اسکوٹر سے گھر آتا ہوں۔ پیسے تو کافی خرچ ہو جاتے ہیں، لیکن تنخواہ کے پیسے بہ حفاظت گھر پہنچ جاتے ہیں۔ پرسوں تنخواہ لے کر دفتر سے چلا تو بیٹھے بٹھائے کفایت شعاری کا بھوت سوار ہو گیا چنانچہ پیسے بچانے کے چکر میں روزانہ کی طرح بس میں سوار ہو گیا۔ تم تو جانتے ہی کہ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی ہے۔ بہ صد مشکل اندر پہنچا اور ایک سیٹ کے ڈنڈے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مسافر ایک دوسرے سے چپکے ہوئے کھڑے تھے اور بس دھچکے کھاتے ہوئے چل رہی تھی۔ بھیڑ اور بس کے دھچکوں نے منٹوں میں حال خراب کر دیا۔ بس تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ کسی نے میری ہپ پاکٹ پر ہاتھ صاف کر دیا۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو میرے برابر کھڑا ہوا مسافر دہاڑا، ابے سیدھا کھڑا رہ دوسرے ہی لمحے مجھ سے آگے کھڑا ہوا مسافر چلایا ابے جیب کاٹتا ہے اور یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے چلایا: ''جیب کترا، جیب کترا۔'' یہ سب چند ثانیوں میں ہوا اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اور اپنے پرس کے غائب ہونے کے بارے میں کسی کو بتاتا آگے پیچھے کھڑے ہوئے مسافروں نے بلا تکلف ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ بس میں ایک شور مچ گیا 'جیب کترا' جیب کترا، اور ایک مسافر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے زور زور سے دوسرے مسافروں کو بتا رہا تھا اجی یہ مجھ سے بار بار چپک کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چپک کر کھڑے ہونے سے میں ہوشیار ہو گیا تھا اور جیسے ہی اس نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا میں نے پکڑ لیا۔ دوسرے مسافر اس کی ہوشیاری پر داد دے رہے تھے اور کچھ نے مجھے جکڑ کر پکڑ رکھا تھا۔ اگلی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے مسافر سیٹ چھوڑ کر مجھے دیکھنے آتے اور ایک آدھ ہاتھ مار کر واپس چلے جاتے۔ میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ ایک آدھ بار میں نے چیخ کر بھی کہا میں جیب کترا نہیں ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں یہ سن کر کچھ لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک بولا لو بھئی۔ اب جیب کترے بھی سرکاری ملازم ہونے لگے۔ ڈرائیور بس تھانے لے چلو، اس کو اس کی سسرال پہنچا دیتے ہیں وہاں پتہ چلے گا اس کو۔

بس جب تھانے پہنچی تو بہت سے مسافر اتر چکے تھے۔ کنڈکٹر، ڈرائیور اور دو تین مسافر مجھے لے کر ڈیوٹی روم میں پہنچے اور بڑے جوش و خروش سے جیب کاٹتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی تفصیل بتائی تو ڈیوٹی آفیسر نے پہلے مجھے بڑے غور سے سر سے پاؤں تک دیکھا، میز پر سے ڈنڈا اٹھایا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، میری کمر پر ڈنڈا مارتے ہوئے بولا بڑا اچھا ہوا آپ لوگوں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، یہ بڑا شاطر جیب کترا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شکل بتا رہی ہے، یہ گھسا ہوا کلاکار ہے، جیب کس کی کٹی ہے وہ رپورٹ لکھائے اس کو ابھی بند کرتا ہوں۔ کنڈکٹر، ڈرائیور اور وہ چاروں پانچوں مسافر ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ جب رپورٹ لکھانے کے لیے کوئی آگے نہیں بڑھا تو میرے جان میں جان آئی اور میں نے اپنی تمام ہمت جمع کر کے کہا۔ حولدار صاحب جیب ان میں سے کسی کی نہیں بلکہ میری کٹی ہے۔ جس آدمی نے میرا پرس نکالا تھا میں نے اس کو دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے خود شور مچا دیا اور الٹا مجھے جیب کترا بنا دیا۔ میں ایک سرکاری افسر ہوں اور بلدیہ میں کام کرتا ہوں۔ میری وضاحت پر حولدار چونکا اور بولا ہیں! آپ سرکاری افسر ہیں اور اب تک بتایا نہیں۔ لگتا ہے وہ جیب کتروں کا کوئی گروپ تھا جس نے آپ کی جیب کاٹی اور آپ ہی کو جیب کترا بنا دیا۔ آپ تو بہت سیدھے سادے دِکھتے ہیں، افسر نظر ہی نہیں آتے اسی وجہ سے ان بدمعاشوں نے آپ ہی کو پھنسا دیا اور دوسرے مسافر بھی آپ کو ہی جیب کترا سمجھ بیٹھے۔ یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور، کنڈکٹر اور مسافروں کو ڈانٹا ڈپٹا اور ہمیں عزت سے رخصت کیا۔ بھائی ممدو یہ کہہ کر ذرا رُکے اور پھر بولے: ''عظیم بھائی، جو مجھ پر گزری میں بتا نہیں سکتا۔ اس دن تو خیر میں بچ گیا، لیکن ایسا پھر کبھی ہو سکتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں کہ افسر نظر آؤں۔ بھائی ممدو مجسم سوال بنے ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہمیں ایک کہاوت یاد آ گئی تھی جو شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے ہمارے اور آپ کے بزرگوں نے وضع کی تھی کہ ''اللہ غلام بنائے، پر غلام کی سی شکل نہ دے۔'' ○○